رضوان اللہ

دعوت دین میں انتقام

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ. وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَہُوَ خَیۡرٌ لِّلصّٰبِرِیۡنَ. وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَلَا تَکُ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ. اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ.

(النحل ۱۶: ۱۲۵-۱۲۸)

”تم، (اے پیغمبر)، اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیتے رہو حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے ساتھ، اور ان کے ساتھ اس طریقے سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے۔ یقیناً تیرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پانے والے ہیں۔ اگر تم لوگ (کسی وقت) بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمھارے ساتھ کیا گیا ہے، لیکن اگر صبر کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہت ہی بہتر ہے۔ (اے پیغمبر)، صبر کرو۔ اور تمھیں یہ صبر خدا کے تعلق ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ تم ان پر غم نہ کرو اور جو چالیں یہ چل رہے ہیں، ان سے تنگ دل نہ ہو۔ بے شک، اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں۔“

اپنی اصل کے اعتبار سے دین کی دعوت پروردگار عالم کی طرف بلانے کا ایک عمل ہے، اس لیے یہ اپنے داعی سے حد درجہ حساسیت اور سنجیدگی کا تقاضا کرتی ہے کہ جس کا اگر لحاظ نہ رکھا جائے تو زندگی بھر کی محنت ضائع ہونے اور جس دین کا نمایندہ ہو کر دعوت دی جا رہی ہو، خود اُس پر بھی حرف آنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس

میں وہ وقت تو بہت سخت امتحان کا ہوتا ہے جب مخاطبین ہر طرح کی ہم دردی اور خیر خواہی کی ناقدری کرتے ہوئے ایذا رسانیوں اور حد درجہ کی نازیبا اور پست حرکتوں پر اتر آتے ہیں اور داعی کے سامنے یہ اہم سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اب کون سا طرز عمل اختیار کرے۔ کیا وہ ان اقدامات کا ترکی بہ ترکی جواب دے یا پھر اپنے مشن کی خاطر ان سے مستقل طور پر درگذر کرتا رہے؟ اس فیصلے میں چونکہ بہت کچھ افراط و تفریط واقع ہو جاتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں اس معاملے کو ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ یہ تفصیل تین عنوانات کے تحت بہ خوبی کی جا سکتی ہے، جیسا کہ انتقام، جواز اور مطلوب:

۱۔ انتقام

اصل میں 'وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ' کے جملے میں ایک فعل 'عَاقَبْتُمْ' استعمال ہوا ہے۔ یہ صرف اپنے ابتدائی معنی، یعنی باری آنے پر کسی سے معاملہ کرنے کے معنی میں نہیں آیا، بلکہ اس کا مطلب باری آنے پر کسی سے انتقام لینے کا ہے۔ اگرچہ لفظ کے اعتبار سے اس کا اطلاق ہر طرح کے اقدامات کا جواب دینے پر کیا جا سکتا ہے، مگر یہاں اس میں 'عقاب'، یعنی سزا کے پہلو کا غلبہ ہونے کی وجہ سے اس کا استعمال محض زبانی یا قولی قسم کی تعدی کے بجاے خاص اُس اقدام کا بدلہ لینے پر کیا گیا ہے جو جان و مال اور عزت و آبرو کو عملی طور پر نقصان دینے والا کوئی معاملہ ہو، اور 'بِمِثْلِ' میں پائے جانی والی مماثلت بھی اسی صورت میں زیادہ مناسب اور موزوں دکھائی دیتی ہے۔ تاہم یہ ایک لطیف پہلو ہے اور طالب علموں سے دقت نظر اور خدا کی کتاب کے اچھے ذوق کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآن نے جو بات یہاں 'عَاقَبْتُمْ' کا فعل لا کر خفیف طریقے سے بیان کی ہے، وہی بات بہر حال ایک دوسرے مقام پر 'الْبَغْیُ' کے اسم کے ذریعے سے کھول کر بھی بتا دی ہے کہ جس کا استعمال ہم جانتے ہیں کہ عام طور پر اسی دوسری نوع کی زیادتی کے لیے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ. (الشوریٰ ۴۲: ۳۹)

''اور وہ کہ جو انتقام اُس وقت لیتے ہیں جب ان پر زیادتی کی جائے۔''

زیر بحث آیات کا سیاق بھی، اگر غور کیا جائے تو اسی تخصیص کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور کسی طرح ممکن نہیں ہو پاتا کہ اس میں زبانی نوعیت کی کسی تعدی کو مراد لیا جا سکے۔ آخر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ پہلے مسلمانوں کو حکمت و دانائی، اچھی نصیحت اور اعلیٰ درجے کی اخلاقی اقدار اپنانے کی تلقین کی جائے اور اس کے فوری بعد یہ کہہ دیا جائے کہ تمھارا مخاطب اگر بدزبانیوں پر اتر آتا ہے تو تمھیں پورا حق حاصل ہے کہ تم بھی اُسی

گھٹیا اور پست سطح پر اتر و اور اُس کو اُسی کی زبان میں کرارا جواب دو؟

بلکہ چند ایک پہلو اور بھی ہیں کہ جن کی وجہ سے اس قسم کے اقدامات کا بدلہ لینے کا ذکر یہاں موجود نہیں مانا جا سکتا۔ وہ اس طرح کہ ان آیات میں بیان کردہ اچھے اوصاف اپنانے کی ہدایت نہ تو وقتی تدبیر کے طور پر دی جا رہی ہے اور نہ یہ تصنع اور دکھاوے اور محض کسی مطلب برآری کے لیے ہی دی گئی ہے۔ 'اُدۡعُ' کے مفعول کا لفظوں میں مذکور نہ ہونا بتاتا ہے کہ یہ مستقل نوعیت کی حکمت عملی کا بیان ہے اور 'اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ' میں تقویٰ اور احسان کا ذکر بتا رہا ہے کہ یہ کسی وقتی غرض کے لیے دی گئی ہدایات نہیں ہیں کہ جب کام بنتا نظر نہ آئے تو داعی اخلاقیات کا مصنوعی چغا اتار کر ہر قسم کی بداخلاقیوں کا جواب دینے کے لیے اکھاڑے میں اتر آئے۔ یہ ادنیٰ تامل معلوم ہو جاتا ہے کہ ان اوصاف کو داعی کی شخصیت کا لازمی حصہ بنا دینا پیش نظر ہے، اور انسانی شخصیت کے اس پہلو کو تو سبھی جانتے ہیں کہ وہ لمحہ بھر میں بدل جانے والی کوئی چیز نہیں کہ ایک وقت میں وہ اعلیٰ ترین اقدار کی پابند ہو اور دوسرے وقت میں وہ اُن سے مکمل طور پر تہی دامن ہو کر لوگوں سے اُن کی بدزبانیوں کا بدلہ لیتی پھرے۔

دراصل، دعوت کے میدان میں یہ صرف عملی نوعیت کے اقدامات ہوتے ہیں کہ جن کا بدلہ لینا جائز قرار پاتا ہے اور اس پر کسی طرح کے اخلاقی سوالات بھی پیدا نہیں ہوتے۔ تاہم، یاد رہے کہ اس میں بھی لازم قرار دیا جاتا ہے کہ ہمیشہ اخلاقی دائرے اور دین میں بیان کردہ منہیات سے پرہیز کرتے ہوئے ہی ان کا جواب دیا جائے۔ اخلاقی دائرے میں رہنے اور منہیات سے پرہیز کرنے کی یہ شرط چاہے لفظوں میں مذکور نہ ہو، مگر محض اس وجہ سے لازم قرار دی جاتی ہے کہ بدلہ لینے کی یہ اجازت ایک مسلمان کو دی جا رہی ہے کہ جس کے ہاں یہ بات پہلے سے ایک مسلمہ اصول کی حیثیت رکھتی ہے[1]۔

اب جہاں تک زبانی اقدامات کا معاملہ ہے تو اسے بھی اچھی طرح سے سمجھ لیا جانا چاہیے۔ عام طور پر اس کی دو صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں: ایک مخاطبین کی طرف سے وقوع پذیر ہونے والی وہ باتیں جو لغویات کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ تنقید برائے تنقید کرتے ہیں، کج بحثی پر اتر آتے اور داعی کی ہر بات میں مین میکھ نکالنے لگتے ہیں۔ اور اسی طرح بے جا قسم کے اعتراضات اٹھاتے، تعصبات کا شکار ہوتے اور ہار جیت کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یاد رہنا چاہیے کہ اس طرح کی تمام باتوں کا جواب دینا تو بہت دور کی بات، ان میں سرے

1۔ ایک حدیث میں اسی اصول کی بنا پر فرمایا ہے: 'ولا تخن من خانک'، ''جو شخص تم سے خیانت کرے، تم جواب میں اس سے ہرگز خیانت نہ کرو'' (ترمذی، رقم ۱۲۶۴)۔

سے ملوث ہونا ہی ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ قرآن میں ایمان والوں کا یہ بنیادی وصف بتایا گیا ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں سے مستقل طور پر اعراض کرتے ہیں، اور اگر ان چیزوں پر کہیں ان کا گزر ہو جائے تو وہ اپنی حیثیت اور سنجیدگی پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتے، بلکہ نہایت وقار اور تمکنت کے ساتھ ان سے پہلو تہی کر جاتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا. (الفرقان ۲۵: ۷۲)

''اور جب کسی بے ہودہ چیز پر ان کا گزر ہوتا ہے تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔''

بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس طرح کے مواقع پر اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر لوگوں سے الجھ جانا، اصل میں شیطان کے کچوکے کا شکار ہو جانا ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ شیطان کی معیت آدمی کا نصیب ٹھیرتی اور اللہ کی رحمتیں اس سے روٹھ کر کہیں دور چلی جاتی ہیں۔ اس سنگین صورت حال کا خدا کی پناہ میں آئے بغیر علاج ہو جانا کسی طرح بھی ممکن نہیں، چنانچہ ایک جگہ نصیحت فرمائی ہے:

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ. (الاعراف ۷: ۲۰۰)

''اور اگر تمھیں کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آجائے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

ان اقدامات کی دوسری صورت وہ ہوتی ہے کہ جن میں داعی کو اشتعال دلانے کی پوری پوری صلاحیت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سخت سست کہنا، مذاق اڑانا، طنز و تعریض کے تیر چلانا، دوسروں کے سامنے اس کی تضحیک کرنا اور ایسا انداز اپنانا کہ سب کے سامنے اس کی بے عزتی ہو۔ اور اس سے آگے بڑھ کر دشنام طرازیاں کرنا اور تنابز بالالقاب، یعنی داعی کو الٹے سیدھے ناموں سے پکارنا۔ سو اس طرح کی تمام باتوں کا جواب دینے[۲] کے بجاے اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اشتعال میں آئے گا اور نہ کبھی غضب ناک ہو گا، بلکہ ہمیشہ عفو و درگزر کا معاملہ کرے گا۔ ظاہر ہے، اس قدر ضبط نفس کا مظاہرہ کرنے کے لیے بڑا اعلیٰ ظرف چاہیے، ذیل کی آیت میں 'ھُمْ' کی ضمیر کا اظہار کر کے اس کمال درجے کے رویہ کو اپنانے پر اُس کی قدر یوں بڑھائی ہے:

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ. (الشوریٰ ۴۲: ۳۷)

''اور جب غصہ آجائے تو وہ درگزر کر جاتے ہیں۔''

۲۔ اس طرح کی باتوں کا جواب اس لیے بھی نہیں دیا جا سکتا کہ ایک حدیث کے مطابق مسلمان کبھی بھی بدزبان نہیں ہو سکتا (احمد، رقم ۳۹۴۸)۔

۲۔ جواز

مذکورہ بالا آیات میں انتقام کی کس قسم کا جواز بیان ہوا ہے، یہ جان لینے کے بعد اب اس جواز کی نوعیت بھی بہت اچھی طرح سے واضح ہو جانی چاہیے، اور اس کے لیے ذیل کی چند باتیں کافی حد تک معاون ہو سکتی ہیں:

ایک یہ کہ 'وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ' میں آنے والا 'وَاِنْ' اصل میں استدراک کو ظاہر کر رہا ہے، مگر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کا مستدرک منہ پیچھے لفظوں میں مذکور نہیں ہے۔ اگر فعل 'عَاقَبْتُمْ' اور سیاق کلام کی رعایت رکھی جائے تو اس کا مقام 'اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ' کے جملے سے پہلے بنتا ہے اور اسے ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے: ''تم اسی طرز کو اپنائے رہو چاہے، یہ تمھارے خلاف کوئی بھی اقدام کریں۔'' مزید یہ کہ 'اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ' میں علم سے مراد اس کا لازم ہے اور گم راہوں کا ذکر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اصلاً انھی کا معاملہ یہاں بیان کرنا مقصود ہے۔ یہ چیزیں اگر سامنے رہیں تو اب 'وَاِنْ عَاقَبْتُمْ' میں بیان کردہ جواز کی نوعیت یہ بنتی ہے: ''لیکن اگر تم پھر بھی بدلہ لینا چاہو تو۔'' اور پوری بات یوں ہو گی: ''اے پیغمبر، تم حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان کے ساتھ بحث بھی اچھے طریقے سے کرو اور (اپنے اس طرز کو بہر صورت اپنائے رکھو، چاہے یہ لوگ کچھ بھی اقدام کریں)، اس یقین کے ساتھ کہ تمھارا رب سب سے واقف ہے، اس لیے وہ خود ہی گم راہوں سے بدلہ لے گا اور جو اس کی ہدایت کو ماننے والے ہوئے انھیں وہ اس کا صلہ بھی دے گا۔ لیکن اگر تم پھر بھی بدلہ لینا چاہو تو...''۔

دوسرے یہ کہ 'وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ' کا جملہ یہاں انتقام کا جواز بتانے کے لیے ہرگز نہیں لایا گیا، بلکہ قرآن کے پیش نظر یہ ہے کہ جو لوگ اپنا بدلہ لینے کے لیے تیار ہو گئے ہیں، اُن پر اچھی طرح سے واضح کر دیا جائے کہ وہ ہمیشہ برابر کا معاملہ کریں گے اور کبھی بھی حد سے تجاوز نہ کریں گے۔

تیسرے یہ کہ 'وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ' میں جب فرمایا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ تم صبر کرو تو یہ اصل میں محض یہ بتانا نہیں ہے کہ انتقام لینے اور نہ لینے کے دو عملوں میں سے ایک زیادہ اچھا ہے، بلکہ اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ان میں سے پہلے عمل کا جواز تمھاری ذاتی حیثیت کا اعتبار کرتے ہوئے بیان کیا جا رہا ہے، وگرنہ دینی اعتبار سے اچھا، بہر صورت یہ دوسرا عمل ہی ہے۔ قرآن میں اس نوع کی اور بھی مثالیں دیکھ لی جا سکتی ہیں، مثلاً سود کے متعلقہ آیات میں 'وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ' کہہ کر واضح فرمایا ہے کہ یہ مال چونکہ تمھارا اپنا ہے، اس لیے ذاتی حیثیت میں تمھارے لیے اس کا واپس لینا بالکل جائز ہے، مگر دینی اور اخلاقی لحاظ سے بہتر

یہی ہے کہ تم تنگ دست کا قرض بالکل ہی معاف کر دو۔

چوتھی بات یہ کہ 'اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ' سے جو آیات شروع ہوئی ہیں، ان میں خطاب اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا ہے، مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ امت کے امام کی حیثیت سے ہے، چنانچہ اس میں دی جانے والی ہدایات اصل میں سب مسلمانوں کے لیے ہیں۔ مگر یہ واحد کے صیغے سے ہونے والا خطاب 'وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ' پر آکر جمع کے صیغے میں بدل جاتا ہے اور ایک جملۂ معترضہ کے بعد 'وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ' میں واحد کے صیغہ کے ذریعے سے یہ آپ کی طرف پھر سے واپس آجاتا ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جواز کا یہ امر نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے اور نہ اُن لوگوں سے جو آپ کی امامت میں مقتدی کے طور پر کھڑے رہنا اپنی سعادت سمجھتے ہوں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ انتقام کی اجازت دینے کے بعد 'وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ' فرمایا ہے۔ یہ ادنیٰ تامل سمجھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کا عطف ''تم اسی طرز کو اپنائے رہو، چاہے یہ تمھارے خلاف کوئی بھی اقدام کریں'' کے اُس جملے پر ہے جو یہاں حذف کر دیا گیا ہے۔ گویا معطوف علیہ میں پایا جانے والا صبر کا ابتدائی مفہوم اس مقام پر آکر اپنے اتمام، یعنی برداشت کرنے کے معنی تک پہنچ گیا ہے۔ سو اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں آپ کو بدلہ لینے کی ہرگز اجازت نہیں دی گئی، بلکہ 'وَاصۡبِرۡ' کے الفاظ میں یہ اصرار فرما دیا ہے کہ بعض لوگ چاہیں تو اپنا انتقام ضرور لے لیں، مگر آپ اور آپ کے متبعین کو بہر حال اس سے بچنا اور برداشت کرتے رہنا ہے۔

یہ تمام باتیں اگر سامنے رہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں بیان ہونے والا جواز مثال کے طور پر، تیمم اور قصر جیسا نہیں ہے کہ جو مستقل طور پر رخصت کا درجہ رکھتے اور اپنی ذات میں نیکی کے کاموں میں سے شمار ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ جواز خالص انسانی سطح کی رعایت کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے بیان کیا ہے کہ تم اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو تمھاری مرضی ہے، وگرنہ اس سے بچ جانا بہت اچھا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر آپ کے لیے اس کی ممانعت بھی کر دی گئی ہے کہ 'وَاصۡبِرۡ'، یعنی تم بس صبر کرو۔ سادہ لفظوں میں اسے ''جوازِ ممنوع'' کہا جا سکتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جواز کی یہ مخصوص قسم محض فقہی ذہن کی گرفت میں آجانا کسی طور ممکن نہیں کہ اس کے لیے قرآن کے اسالیب کی کما حقہٗ واقفیت ہونا بہت ضروری ہے۔

۳۔ مطلوب

اب یہ بات بھی سمجھ لی جانی چاہیے کہ اس معاملے میں خدا اپنے بندوں سے کس قسم کے رویے کی توقع رکھتا

ہے۔ دعوت کے میدان میں ہر طرح کے گرم سرد حالات کے باوجود متحمل مزاج رہنا، ایک مشکل امر ہے، مگر 'وَاصْبِرْ' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس کے ہاں مطلوب یہی ہے کہ ہم طاقت رکھنے کے باوجود ان زیادتیوں کا بدلہ ہرگز نہ لیں۔ اس عدم انتقام کا حاصل کیا ہو سکتا ہے، اسے یوں واضح فرمایا ہے: 'وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ'۔

اس میں دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ صبر کرنے والوں کے لیے یہ تو ارشاد ہوا ہے کہ وہ ان کے لیے بہت اچھا ہے، مگر یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ کس اعتبار سے، اور اس ابہام ہی کی وجہ سے اس میں عمومیت کا معنی پیدا ہو گیا ہے کہ یہ دنیا اور آخرت، دونوں کے لحاظ سے ہے۔ ضمیر کے بجاے چونکہ 'الصّٰبِرِيْن' کا اسم لایا گیا ہے، اس وجہ سے اس کے دنیوی فائدوں میں دعوت کو پہنچنے والا فائدہ بدرجۂ اتم آ گیا ہے کہ اسی کے لیے یہ لوگ اس قدر مصائب جھیلتے ہوئے آخر کار صابرین کہلائیں گے۔ بلکہ غور کیا جائے تو صبر کے عمل پر جو آخرت میں اجر ملنے کا وعدہ کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی تو ہوتی ہے کہ اس کے نتیجے میں دین کی دعوت کو فائدہ حاصل ہونے کا امکان ہوتا ہے، نہ کہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اذیتوں کو برداشت کرنا اپنی ذات میں کوئی بہت اچھا کام ہے۔

عملی طور پر بھی دیکھا جائے تو فائدہ اور نقصان کی یہ بات ہر طرح سے واضح ہو جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جب داعی کسی مار کا بدلہ لیتے ہوئے اپنے مخاطب کو مارے گا تو اس سے کسی قدر اطمینان اور تسلی تو اس کو ضرور ہو جائے گی، مگر لازمی بات ہے کہ دوری کا ماحول پیدا کر کے وہ خود اپنے ہاتھوں سے دعوت کا دروازہ بند کرے گا۔ دنیا میں اس طرح کے لوگ شاذ ہی پائے جاتے ہیں کہ جن کے ساتھ آپ باہم دست و گریبان ہو چکے ہوں اور وہ اس کے باوجود آپ کی بات پر توجہ دیں اور اسے قبول کر لیں۔ بدلہ لینے سے دعوت کے میدان میں ہونے والا یہی نقصان پیش نظر ہے کہ ایک جگہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو معاف کرے اور اس طرح لڑائی کے بجاے صلح کا ماحول پیدا کر دے، اُس کا اجر اللہ کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے:

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ. (الشوریٰ ۴۲: ۴۰)

''پھر جس نے معاف کیا اور معاملے کی اصلاح کر لی تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

بدلہ لینا من جانب نفس ہونے کی وجہ سے ہم جانتے ہیں کہ انسانی طبیعت کے لیے اپنے اندر شدید کشش رکھتا اور اس وجہ سے بہت مرغوب کام ہے، مگر اس کے مقابلے میں بدلہ نہ لینا اپنے نفس اور اس کی اکساہٹوں کو دبانا ہے اور اس لحاظ سے ایک نہایت مشکل کام ہے۔ چنانچہ خصوصی ہدایت فرمائی ہے کہ اس کی توفیق تم اللہ سے مانگو کہ یہ متاع صرف وہیں سے تمھیں میسر آ سکتی ہے: 'وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ'۔

جنت میں مختلف درجات ہیں جو عمل کی کمی یا زیادتی اور اُس کے لیے اٹھائی جانے والی مشقت کے کم یا زیادہ ہونے کی بنیاد پر دیے جائیں گے۔ چنانچہ صبر کرنے کے حکم سے آگے بڑھ کر فرمایا ہے کہ نیکی اور برائی اپنی ذات میں دو مختلف چیزیں ہیں اور اس وجہ سے دو مختلف نتائج بھی رکھتی ہیں، چنانچہ ہونا یہ چاہیے کہ مخاطبین کی زیادتیوں کے بدلے میں ان سے مزید بھلائی کا برتاؤ کیا جائے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ دعوت کے لیے درکار ماحول پیدا ہو گا، بلکہ دوستی کے تعلقات بھی قائم ہوں گے، اور ظاہر ہے کہ اس سے دعوت کے نتیجہ خیز ہونے کے امکانات اور زیادہ بڑھ جائیں گے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ. (حٰم السجدہ ۴۱: ۳۴)

”حقیقت یہ ہے کہ بھلائی اور برائی، دونوں یکساں نہیں ہیں۔ (اس میں شبہ نہیں کہ تمھارے یہ منکرین اب برائی کے درپے ہیں، لیکن) تم برائی کے جواب میں وہ کرو جو اس سے بہتر ہے تو دیکھو گے کہ وہی جس کے اور تمھارے درمیان عداوت ہے، وہ گویا ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اوپر کی جانے والی تمام گفتگو کا چند جملوں میں خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے نزدیک اس معاملے میں مطلوب صورت برائی کے جواب میں اچھائی کرنا یا کم سے کم بدلہ نہ لینا ہے۔ مگر ہر کسی کا حوصلہ ایک جیسا نہیں ہوتا، اس لیے اگر کوئی شخص بدلہ لینے کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے یہ حق حاصل ہے۔ مگر اسے اول تو یہ جان لینا چاہیے کہ وہ بدزبانیوں کے بجاے صرف عملی اقدامات کا بدلہ لے سکتا ہے[۳]۔ دوسرے یہ کہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو دعوت کی مسند سے اترنے اور اپنی ذاتی حیثیت میں جا کر یہ سب کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے، اس سے اُس کی ذاتی تسکین کا سامان تو بہت کچھ ہو جاتا ہے، مگر اُس دعوت کو نقصان پہنچنے کا شدید خطرہ لاحق ہو جاتا ہے جو اُس کی طرف سے یا اس جماعت کی طرف سے پیش کی جا رہی ہوتی ہے کہ جس کا وہ ایک فرد ہوتا ہے۔

۳۔ اور خاص طور پر اُن بدزبانیوں کا بدلہ تو بالکل نہیں لیا جا سکتا کہ جن کے ظہور کی وجہ خود اُس کا اپنا کوئی فعل ہو، جیسے مخاطب کو اس حد تک زچ کر دینا کہ وہ اس سے مشتعل ہو کر بدگوئی کرنے لگے، اس لیے کہ اس صورت میں تو اُس کی بدگوئیوں کا وبال بھی داعی کے اپنے سر آجاتا ہے۔